دُنیا ایک بار پھر عظیم الشان جنگ کے ذریعہ قیامت کا نظارہ دیکھنے والی ہے

(فرمودہ ۸؍جنوری ۱۹۳۷ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

انسانی عقل ایک ایسے مقام پر کھڑی رہتی ہے کہ جس سے ذرا اِدھر اُدھر ہو کر انسان تباہی و بربادی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ گویا انسانی ارادہ ہر وقت پُل صراط پر رہتا ہے کہ جس کے اندر ذرا سا تغیر یا تبدیلی پیدا ہونے کی وجہ سے نہایت خطرناک نتائج نکل آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار اور معقول انسان ان غفلت کی گھڑیوں میں جبکہ وہ عقل وفہم کو قابو میں نہیں رکھ سکتے ،ایسی ایسی حرکات کے مرتکب ہو جاتے ہیں کہ دوسرے تو الگ رہے وہ خود بھی اپنی عقل کی گھڑیوں میں اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں اور اگر ان پر وہ ساعتیں ملامت کی نہ آئیں تو کم سے کم دنیا ان پر ہمیشہ کیلئے ملامت کرتی رہتی ہے۔ وہ جابر بادشاہ جنہوں نے اپنی طاقت کے اوقات میں کئی شہروں اور مُلکوں کیلئے قتلِ عام کے حکم دیئے تھے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پر ندامت کے ساعات آئیں یا نہ آئیں ،لیکن اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ میں ان واقعات کو پڑھ کر سینکڑوں ہزاروں سال بعد بھی لوگ ان پر لعنتیں بھیجتے ہیں اور ان کے افعال کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہلاکو خان [1] نے جب بغداد تباہ کیا یا نادر شاہ [2] نے جب دلی کے قتلِ عام کا حکم دیا اُس وقت

کے حالات کے مطابق وہ یہی سمجھتے ہوں کہ دیکھو ہم کتنے طاقتور ہیں۔ لیکن ان کے بعد آنے والی نسلیں جن کی تعریف یا مذمت کوئی قیمت رکھتی ہے وہ بغداد کی تباہی یا دِلّی کے قتل عام کے حالات پڑھ کر جس نفرت وحقارت سے ان افعال کو دیکھتی ہیں اِس کا اندازہ اگر اُس وقت ہلاکو یا نادرشاہ کو ہو جاتا تو میں سمجھتا ہوں باوجود بڑے بڑے طاقتور بادشاہ ہونے کے وہ اِن افعال سے باز رہتے۔ وہ بیوقوف لوگ نہیں تھے، سمجھدار اور عقلمند لوگ تھے۔ ایک بیوقوف آدمی کس طرح ہزاروں لاکھوں کی کمان کر سکتا ہے اور کس طرح اتنے وسیع رقبوں پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ ان کی فتوحات اور حکمرانیاں بتاتی ہیں کہ وہ سمجھدار تھے مگر یہ افعال بتاتے ہیں کہ اتنے سمجھدار لوگوں پر بھی کسی وقت کمزوری اور ضُعف کا وقت آجاتا ہے۔ تو یہ جابر بادشاہ جنہوں نے بڑے بڑے رقبوں اور علاقوں پر حکومتیں کیں اپنے دوسرے اعمال سے عقل اور سمجھ کا ثبوت دیتے ہیں مگر ان سے ایسے افعال بھی سرزد ہوئے جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ پاگل تھے۔

انسانی جان کی قیمت کتنی بڑی ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ جس نے ایک شخص کو مار دیا اُس نے گویا سارے جہان کو مار دیا۔ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا[3] یعنی ایک شخص کے قاتل کی مثال ایسی ہی ہے جیسے وہ سارے جہان کا قاتل ہے اور اگر ایک شخص کا قتل ایسا بھیانک فعل ہے تو جنہوں نے شہروں میں قتلِ عام کر دیا اور حکم دے دیا کہ گلیوں میں چلتا، بازاروں میں پھرتا یا دروازوں میں کھڑا جو شخص بھی ملے اُسے قتل کر دیا جائے، وہ کتنے خوفناک جُرم کے مرتکب تھے۔ مگر اس کے ارتکاب کی اُن کی عقلوں نے اجازت دی۔ حالانکہ وہ لوگ بڑے بڑے سمجھدار تھے۔ اِس زمانہ کے لوگ اپنے بزرگوں پر حرف گیری کے بڑے عادی ہیں۔ ایک بچہ بھی جب تاریخ میں اِن واقعات کو پڑھتا ہے تو کہہ اُٹھتا ہے کہ وہ لوگ بڑے وحشی تھے، بڑے غیر مہذب اور بڑے غیر متمدن تھے کیونکہ انہوں نے ہزاروں اشخاص کو مروا دیا اور دل میں ایک فخر محسوس کرتا ہے کہ اسے خدا نے ایسے زمانہ میں پیدا کیا ہے یا اگر وہ خدا کا قائل نہیں تو اتفاقی طور پر وہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جب کہ لوگ بہت مہذب اور بہت متمدن ہیں اور جبکہ ایسی حرکات کو بالکل ناجائز سمجھا جاتا ہے۔

مگر غور کرنا چاہئے کہ کیا یہ خیالات درست ہیں؟ کیا واقعہ میں آج انسان ایسا مہذب و متمدن ہو گیا ہے کہ انسانی جان کی قیمت بڑھ گئی ہے؟ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بیسیوں ڈاکٹر اپنے گھروں کو چھوڑ کر

غیر ممالک کو جاتے ہیں اور اس لئے تکالیف اُٹھاتے ہیں کہ بیماروں کا علاج کریں۔ کوئی انگلستان کو چھوڑ کر چین چلا جاتا ہے، کوئی افریقہ کے جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے، کوئی ہندوستان میں آ کر کوڑھیوں کے علاج میں مصروف ہے تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ آجکل کے لوگ بہت متمدن ہیں اور دوسرے کی جان لینے کی بجائے اسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے بالمقابل ہم یہ دیکھیں کہ ہزاروں لوگ ایسی ایجادیں کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ جن کے ذریعہ ایک حملہ سے سینکڑوں ہزاروں لوگ مر جاتے ہیں یا عمر بھر کیلئے بیکار ہو جاتے ہیں تو عقل یہ تسلیم کرنے سے عاجز آ جاتی ہے کہ بچانے والے افعال انسانیت اور تمدن کا نتیجہ تھے۔ اگر اُس زمانہ کا انسان ترقی کر چکا ہوتا، زیادہ متمدن ہو چکا ہوتا، پہلوں سے زیادہ مہذب ہوتا، انسانیت کے زیادہ قریب ہو چکا ہوتا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک بھائی تو ایک جان کو بچانے کیلئے اپنا وطن چھوڑتا اور دوسرا بھائی جس سے پہلے کو بھی پوری ہمدردی ہے اس لئے گھر سے نکلتا کہ نہتے اور کمزور ہزاروں انسانوں کو ایک ہی بم سے اُڑا دے۔ اگر تہذیب نے ترقی کی ہوتی تو لوگوں کا اکثر حصہ ہمیں ایسا نظر آتا جو ایسے جان لینے کے ذرائع کو حقارت کی نظر سے دیکھتا لیکن ہمیں نظر یہ آتا ہے کہ انسان کی جان لینے کیلئے اور ایسی ایجادیں کرنے کیلئے کہ کس طرح مخالف کو آسانی سے اپاہج اور بیکار کیا جا سکتا ہے، اتنے آدمی مصروف ہیں کہ جان بچانے کی فکر کرنے والے اتنے نہیں۔ پھر جو جان بچانے کی فکر میں ہیں ان کے دل بھی ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو جان لینے والی ایجادات کرنے میں منہمک ہیں۔ جب جرمنی سے جنگ ہو رہی تھی کیا انگلستان کے وہ ڈاکٹر جو اپنی رحم دلی کا ثبوت دینے کیلئے ہندوستان میں کوڑھیوں کے علاج میں مصروف تھے یا ملیریا کے ازالہ کیلئے کام کر رہے تھے، اُن کے دلوں سے ہر وقت یہ آواز نہیں اُٹھ رہی تھی کہ خدا ہمارے بھائی کو طاقت دے تا وہ زیادہ سے زیادہ جرمنوں کے سر کاٹ سکے اور کیا وہ درخواستیں نہیں کر رہے تھے کہ انہیں بھی جنگ میں شامل ہونے کا موقع دیا جائے تا وہ اپنے جان بچانے والے کام کو چھوڑ کر جان لینے کا کام کر کے راحت حاصل کر سکیں اور پھر کیا یہی حال آسٹرین اور جرمنوں کا بھی نہیں تھا؟ ہزاروں ڈاکٹر جو ہمیشہ مریضوں کو تسلی دیتے تھے کہ ہم ہر قربانی کر کے تمہاری جان بچائیں گے کیا اُس وقت سارا زور نہیں لگا رہے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکے اپنے مخالفوں کی جانیں زیادہ سے زیادہ نکال سکیں۔ پس اِس نظارہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے تہذیب و تمدن میں نہیں

بلکہ فریب اور دھوکا دینے میں، ظاہر داری میں اور جھوٹ میں ترقی کی ہے۔
ہلاکو لوگوں کو مروا تا تھا اور کہتا تھا کہ میں مارنے کیلئے آیا ہوں مگر آج کے ہلاکو جب مارتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم خدمت کیلئے آئے ہیں۔ نادر نے یہ کہہ کر قتل عام کرایا تھا کہ میں اسے جائز سمجھتا ہوں مگر اِس زمانہ کے کتنے نادر ہیں جو شہروں کو اُجاڑتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ ہم اس قوم کی آزادی اور برتری کیلئے آئے ہیں۔ ذرا غور کرو نادر نے دِلّی میں جو قتلِ عام کیا اس کی کیا حقیقت تھی اس خونریزی کے مقابلہ میں جو ایبے سینیا میں اٹلی نے کی ہے۔ اَبی سینیا میں معمولی آدمی تو الگ رہے خود بادشاہ بھی زہریلے بموں کے اثر سے بچ نہیں سکا اور سر سے پیر تک زخمی ہو گیا۔ اچھے اچھے سمجھدار آدمی، مدبرین اور جرنیل پاگلوں کی طرح چیخیں مارتے پھرتے تھے۔ جتنی تباہی حبشہ میں اٹلی کی بمباری نے کی اتنی تو دِلّی میں نہیں ہوئی ہوگی۔ مگر نادر نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ میں دلی کی اصلاح کیلئے آیا ہوں بلکہ اس نے یہی کہا تھا کہ میں قتل کیلئے آیا ہوں۔ وہ قاتل بیشک تھا مگر جھوٹا نہیں تھا مگر آجکل کے قاتل اپنے فائدہ کیلئے غریبوں کی کھالیں اُدھیڑتے ہیں مگر کہتے یہ ہیں کہ ہم رفاہِ عام کر رہے ہیں، ملک کی ترقی کیلئے آئے ہیں یہ لوگ پہلوں سے زیادہ قاتل ہیں اور پھر ساتھ جھوٹے بھی ہیں۔ اِن حالات میں ہماری جماعت (جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے نزدیک جماعت میں شامل ہیں وہ کنویں کے مینڈک نہیں۔ جو سمجھتے ہیں چندہ دے دینا اور نمازیں پڑھ چھوڑنا کافی ہے) کے وہ دوست جو قرآن کریم اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہاموں پر غور کرتے ہیں اور جو جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی جماعتیں دنیا کو بدلنے کیلئے آتی ہیں۔ جن میں سے ایک معمولی زمیندار جب اپنے کھیت میں ہل چلا رہا ہوتا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ مجھے غلّہ کتنا آئے گا، بلکہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ امریکہ اور جاپان کی اصلاح کس طرح ہوگی۔ ایک درزی جب پاجامہ سی رہا ہوتا ہے تو اُس کا خیال اس طرف نہیں ہوتا کہ مجھے اس کی کتنی اُجرت ملے گی بلکہ وہ یہ خیال کر رہا ہوتا کہ فلپائن اور امریکہ میں کس طرح پاک انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک بڑھئی جب لکڑی صاف کر رہا ہوتا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ اس سے تیار شدہ میز یا کرسی کتنے میں بکے گی بلکہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ دنیا کی اقتصادیات اور تہذیب وتمدن کی اصلاح کیلئے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ یہ وہ جماعت ہے جو حقیقتاً خدا کی جماعت ہے کنویں کے وہ مینڈک جماعت نہیں جو محض اس لئے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہت نہیں دی، سمجھتے ہیں کہ دنیا سے ہمیں کیا سروکار اور ہمیں ان باتوں پر غور

کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس دوسری قسم کے لوگوں کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ اُن کو کرتا ہوں جو خدا کے نزدیک بھی جماعت میں شامل ہیں۔

بابرؒ نے اپنے دشمنوں سے گیارہ مرتبہ شکست کھائی اور اس کے بعد وہ بیان کرتا ہے کہ میں پاخانہ بیٹھا ہؤا ابھی ملکوں کی فتوحات کے متعلق سوچا کرتا تھا اور میری ترقی کا ذریعہ ہی یہ ہؤا کہ ایک مرتبہ پاخانہ بیٹھے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک چیونٹی ایک دانہ کو دیوار پر چڑھانا چاہتی ہے دانہ بڑا اور وہ چھوٹی تھی بار بار چڑھتی اور پھر گر جاتی تھی اور اسی طرح وہ بیس سے زیادہ بار گری لیکن آخرکار کامیاب ہوگئی۔ یہ دیکھ کر مجھے استنجے کی بھی ہوش نہ رہی اور میں نے خیال کیا کہ کیا میں اِس چیونٹی سے بھی گیا گزرا ہوں کہ گیارہ شکستوں سے ڈر جاؤں۔ چنانچہ اُس نے پھر اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی دی اور آج دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ پھر کیا ہماری جماعت کیلئے جسے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فتوحات پر فتوحات دی ہیں اور جس نے شکست کا نام بھی نہیں سنا، مناسب ہے کہ خیال کرے ہمیں دنیا سے کیا؟

ہمارے ایک غریب زمیندار کو جو دو یا چار کنال زمین پر گزراوقات کرتا ہے، یہ ہرگز ہرگز خیال نہیں کرنا چاہئے کہ مجھے دُنیا کی سیاست سے کیا سروکار۔ ایک غریب تاجر جو چار یا چھ آنے یومیہ کماتا ہے اسے یہ خیال کر لینا مناسب نہیں کہ مجھے غیر ممالک میں پیدا ہونے والے انقلابات سے کیا واسطہ۔ اسی طرح ایک چھوٹے مدرّس کو جو الف۔ ب پڑھاتا ہے یہ ہرگز سمجھنا نہیں چاہئے کہ مجھے دُنیوی علوم سے کیا تعلق۔ اسی طرح ہمارے بڑھئی، درزی اور دھوبی کو یہ کبھی نہیں سمجھنا چاہئے کہ میں جو کماتا ہوں اس میں سے حسبِ حیثیت چندہ دے دیتا ہوں مجھے اس سے کیا مطلب کہ دنیا کی اقتصادی حالت کیسی ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اسے اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ دُنیا کو الٹ دے۔

جو شخص بھی اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ گویا اقرار کرتا ہے کہ اس جماعت کی ذمہ واریوں کو وہ قبول کرتا ہے۔ اور اگر ابھی وہ زمانہ نہیں آیا کہ وہ باہر نکلے تو کم سے کم اسے یہ خیال تو کرنا چاہئے کہ وہ کس غرض کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ کیا فوجی سپاہی ہر روز لڑائی کرتے ہیں؟ یا کیا پولیس والے ہر روز چوروں کو پکڑا کرتے ہیں؟ مگر کیا کبھی کسی سپاہی کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ میں لڑنے کیلئے نہیں ہوں؟ ایک پولیس مین خواہ دس سال تک کسی چور کو نہ پکڑ سکے اس کے مدنظر یہی ہوگا کہ جب بھی موقع

ملے، اسے پکڑوں۔ اور اگر وہ بددیانت ہے تو یہ خیال آئے گا کہ روپیہ لے کر اسے چھوڑ دوں مگر روپیہ بھی تو اسی حالت میں لے گا جب اسے پکڑے گا۔ بہرحال چور کو پکڑنے کا خیال اس کے مدنظر ہوگا۔ ایک سپاہی کے سامنے بھی ہمیشہ لڑائی ہوگی۔ اگر وہ بہادر ہے تو وہ خیال کرے گا کہ اگر لڑائی ہوئی تو میں اپنے ملک کیلئے یوں جان قربان کردوں گا اور دشمن کو شکست دوں گا۔ اگر کم بہادر ہے تو وہ خیال کرے گا کہ خدا کرے لڑائی نہ ہو۔ کیونکہ اگر ہوئی تو مجھے لڑنا پڑے گا۔ اور اگر وہ بُزدل ہے تو خیال کر رہا ہوگا کہ اگر لڑائی ہوئی تو میں بھاگوں گا کس طرح۔ پس خواہ اپنی بہادری دکھانے کیلئے ہو خواہ لڑائی سے بچنے کیلئے اور خواہ بھاگنے کی تجاویز سوچنے کیلئے، بہرحال سپاہی کے مدنظر لڑائی ضروری ہوگی۔ اسی طرح تم میں سے خواہ کوئی بڑھئی ہے یا دھوبی یا جولاہا، معمولی زمیندار ہے یا ادنیٰ تاجر، اگر اپنا اپنا کام کرتے وقت اُس کے ذہن میں دُنیا کی اصلاح کی تجاویز نہیں آتیں تو گویا اُس نے اپنی پیدائش کی غرض نہیں سمجھی۔

میں تو حیران ہوتا ہوں کہ بعض دوست شکایت کرتے ہیں کہ الفضل میں سیاسی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر وہ دنیا کی سیاسیات سے واقف نہیں ہوں گے تو اس کی اصلاح کیسے کریں گے۔ کیا سیاست قرآن کریم کا حصہ نہیں؟ ہاں اگر کوئی بات غلط شائع ہو تو اعتراض ہوسکتا ہے۔ ایک دوست کو شکایت ہے کہ جاپان کے حالات اخبار الفضل میں کیوں درج ہوتے ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جن کو میں کنویں کے مینڈک کہتا ہوں۔ فکر تو یہ ہونی چاہئے کہ جاپان کے حالات تو شائع ہوتے ہیں فلپائن کے کیوں نہیں ہوتے؟ روس کے کیوں نہیں ہوتے؟ یہ غم تمہیں کھائے جانا چاہئے کہ کیا یہی ہماری پہنچ ہے کہ ہمارے اخبار میں صرف جاپان کے حالات ہی شائع ہوتے ہیں۔ ہمارے دوستوں کو اِس پر گلہ ہونا چاہئے کہ جو نہیں چھپا نہ کہ اُس پر جو چھپ رہا ہے۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ کیا جاپان کی اصلاح ہمارا فرض نہیں؟ اگر ہے تو اس کے حالات کا علم نہ ہوگا تو ہمارے دل میں اس کیلئے درد کس طرح پیدا ہوگا اور ہم اس کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔

پس ہماری جماعت کو اپنے فرائض کو سمجھنا چاہئے اور یاد رکھنا چاہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں دنیا کی اصلاح کیلئے پیدا کیا ہے۔ خاص کر ایسے وقت میں جبکہ دنیا میں اِس قدر خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ کیا ایک طبیب کہہ سکتا ہے کہ لوگ آ کر مجھے تنگ کرتے ہیں جو اپنی بیماریاں مجھے بتاتے ہیں؟ اگر وہ ان بیماریوں سے آگاہ نہ ہو تو علاج کس طرح کرسکتا ہے۔ اسی طرح جب تک تم دنیا کے حالات سے واقف

نہ ہوا اُس کی اصلاح کیسے کر سکتے ہو۔ ہم نے اپنے زور سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت بڑا کام کیا ہے۔ حیاتِ مسیح کے عقیدہ کو بدل دیا ہے، قرآن کریم کے نسخ کے خیالات کو بدل دیا ہے۔ عیسائی ممالک میں بائبل کے متعلق عیسائیوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہے مگر ابھی یہ کام ایسا ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں کنواں۔ ہمارا تعلق ساری دنیا سے ہے اس لئے ہمیں سوچنا چاہئے کہ دنیا کو ان مختلف بلاؤں سے کس طرح نجات دلائی جاسکتی ہے جو اس پر نازل ہو رہی ہیں۔ اگر اس خیال سے کہ ہمارے پاس طاقت نہیں بیٹھ جائیں تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک میراثی بیکار رہنے کا عادی تھا۔ اُس کی بیوی ہمیشہ اُسے کہتی کہ کوئی کام کرو مگر وہ جواب دیتا کہ کام ملتا نہیں۔ آخر جنگ شروع ہوئی اور لوگ بھرتی ہونے لگے۔ اُس کی بیوی نے کہا کہ جاؤ تم بھی فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ بیویاں تو اپنے خاوندوں کی خیر خواہ ہوتی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم میری دشمن ہو اور چاہتی ہو کہ میں لڑائی میں شامل ہوں اور مارا جاؤں۔ اُس کی بیوی نے کچھ چنے لئے اور انہیں چکی میں پیسنے لگی۔ بعض اوقات چکی میں کسی جگہ آٹا جمع ہو جائے تو سل اونچی ہو جاتی ہے اس لئے بعض دانے ثابت ہی نکل آتے ہیں۔ میراثن نے اپنے خاوند کو بلایا اور کہا کہ دیکھو جسے خدا بچانا چاہے وہ چکی کے پاٹ میں سے بھی سلامت نکل آتا ہے اس لئے تم کیوں یہ خیال کرتے ہو کہ ضرور مارے جاؤ گے؟ اِس پر میراثی نے جواب دیا کہ ''تُو مینوں دلیاں ہویاں وچہ ای سمجھ لے'' یعنی تُو میرا شمار انہی دانوں میں کر جو پیسے جا چکے ہیں۔ تو اس قسم کے خیال وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنا شمار پہلے ہی پسے ہوؤں میں کر لیتے ہیں۔

جنگِ عظیم میں بعض انگریزی فوجوں کے آدمی وسط جرمنی میں جا کر قید ہوئے اور پھر ساری فوجوں اور حفاظتوں سے بچتے ہوئے بھاگے اور اپنے ملک میں سلامت پہنچ گئے۔ ایمڈن جرمنی کا ایک چھوٹا سا جہاز تھا جس نے مدراس پر آ کر گولہ باری کی۔ ہندوستانی چونکہ جنگی فنون سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے جب ایمڈن نے مدراس پر گولہ باری کی تو باوجودیکہ مدراس یہاں سے بارہ سَو میل دُور ہے، پنجاب کی عورتوں کے دل دھڑکنے لگے تھے۔ اس جہاز کو آسٹریلیا کے قریب جا کر انگریزی علاقہ میں اور انگریزی جزیرہ میں انگریزی فوجوں نے تباہ کیا۔ وہ ملک انگریزوں کا تھا۔ اس کے ایک طرف جاپان تھا جو انگریزوں سے ہمدردی رکھتا تھا دوسری طرف روس تھا جو خود جنگ میں شامل تھا مگر پھر بھی ایمڈن

والوں کا ایک حصہ وہاں سے بھاگ کر نکل گیا اور کم سے کم ایک شخص تو جاپانی، انگریزی اور روسی فوجوں سے بچتا ہوا جرمنی جا پہنچا اور پھر جنگ میں شریک ہو گیا جو ابھی جاری تھی۔ جس وقت جہاز تباہ ہوا وہ اگر پیشاب خطا کر کے بیٹھ جاتے تو پکڑے جاتے مگر انہوں نے جرأت کی اور بچ کر نکل گئے۔ انہوں نے اپنے حیرت انگیز حالات بیان کئے ہیں کہ وہ کس طرح بچ کر نکل گئے اور پھر لڑائی میں شامل ہو گئے۔ فرانس اور اٹلی وغیرہ سب ممالک کے لوگوں نے ایسے کارنامے دکھائے۔ بعض قید ہو گئے اور سات سات سال قید رہے۔ اب بھی کئی قیدی ہیں جو جیل خانوں میں ہی مر جاتے ہیں مگر کئی ہیں جو دو چار ماہ بعد ہی بھاگ نکلتے ہیں۔ پس اگر انسان حوصلہ نہ ہارے تو سَو راہیں نکل آتی ہیں اور ہمارے لئے تو ایک راستہ بنا بنایا ہے ہم دعا تو کر سکتے ہیں۔

میں اِس وقت جماعت کو اِس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اِس زمانہ میں پھر دنیا میں شدید تغیرات پیدا ہو رہے ہیں اور عنقریب شدید لڑائی لڑی جانے والی ہے جو انگریزوں و جرمنوں کی گزشتہ جنگ سے بھی سخت ہو گی۔ یہ اِس وقت تک اِس وجہ سے رُکی ہوئی ہے کہ انگریز ابھی تیار نہیں۔ اگر تیار ہوتے تو اٹلی نے جس وقت حبشہ پر حملہ کیا تھا اُسی وقت جنگ چھڑ جاتی۔ جنگِ عظیم کے بعد انگریز بیچارے تو صلح صلح پکارتے رہے اور یورپ کی دوسری قومیں اپنی فوجی طاقت کو بڑھاتی رہیں اور اب نتیجہ یہ ہے کہ اٹلی جو چھوٹا سا ملک ہے خم ٹھونک کر چیلنج دے رہا ہے اور انگریز خاموش ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ انگریز لڑنا نہیں چاہتے۔ بیشک انگریزوں میں بعض ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر جرمنی انگلستان پر بھی قبضہ کرے تو کیا۔ ایک اور لیبر لیڈر نے تو اِس قسم کی ایک تقریر حال میں ہی کی ہے مگر بعض ایسے بھی تھے جو محسوس کر رہے تھے کہ ہماری ذلّت ہو رہی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر لڑائی ہوئی تو اس سے بھی زیادہ ذلّت ہو گی۔ اُس وقت سے انگریز بھی برابر سامانِ جنگ بڑھا رہے ہیں مگر جرمنی اور اٹلی بھی اب بہت سمجھدار ہو رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انگریز ۱۹۳۷ء کے آخر تک نہیں لڑ سکتے اِس لئے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ گو یہ بھی ممکن ہے کہ اگر بہت زیادہ مجبور کیا جائے تو برطانوی حکومت ۱۹۳۷ء میں ہی لڑ پڑے لیکن یوں حکومت کا پروگرام ۱۹۳۸ء میں پورا ہو گا۔ ابی سینیا کے بعد اٹلی نے سپین میں سوال اُٹھا دیا ہے۔ انگریزی اخبارات کے بیان کے مطابق اٹلی والوں کا ڈھنگ عجیب ہے۔ وہ ایک کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ صلح کی ہر مجلس میں بھی شریک ہوتے ہیں اور جب صلح کی تجاویز ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو

کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ اس سوچنے کے دوران میں حملہ بھی جاری رکھتے ہیں اور جب وہ علاقہ فتح ہو جاتا ہے یا کام ختم ہو جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو صلح پر تیار تھے مگر افسوس اب تو وہ علاقہ فتح ہی ہو گیا اور پھر کسی اور جگہ پر اپنا رسوخ بڑھانے لگ جاتے ہیں۔ اور پھر جب انگریز اور فرانسیسی سوال اُٹھاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ معاملہ ذرا پیچیدہ ہے سوچ سمجھ کر جواب دیں گے۔ ادھر برطانیہ اور فرانس بھی جانتے ہیں کہ اِس سوچنے کا کیا مطلب ہے مگر کر کچھ نہیں سکتے۔ مثلاً آجکل والنٹیئروں کا سوال ہے۔ اٹلی اور جرمنی سے برابر والنٹیئر سپین جا رہے ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی کہتے ہیں یہ ٹھیک نہیں۔ اٹلی اور جرمن والے کہتے ہیں کہ اچھا ہم غور کر کے جواب دیں گے۔ مگر ساتھ ہی ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء سے ۲ر جنوری ۱۹۳۷ء تک دس ہزار والنٹیئرز اٹلی سے اور دس ہزار جرمنی سے سپین پہنچ گئے ہیں۔ باغیوں نے ساٹھ ہزار کا مطالبہ کیا تھا۔ اگر یہ درست ہے تو غالباً جب ساٹھ ہزار آدمی پہنچ جائے گا پھر یہ اقوام کہہ دیں گی کہ اچھا اب والنٹیئر روانہ نہ کئے جائیں۔

اگر غور کیا جائے تو اصل میں یہ قصور دونوں کا ہے۔ اٹلی والے دیکھتے ہیں کہ فرانس اور انگلستان کے پاس بہت سی نوآبادیات ہیں اور ہمارے پاس کوئی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ یہ دوسرے ملکوں سے فائدہ اُٹھائیں اور ہم نہ اُٹھائیں۔ چونکہ انگلستان کے بعض مقتدر مصنف اور سیاست دان غلطی سے یہ کہتے رہے ہیں کہ ہم ہندوستان کو تہذیب اور شائستگی سکھانے جاتے ہیں جو غلط بات ہے اور میں بار بار اس کے متعلق انگریز کو توجہ دلا چکا ہوں کہ اِس دلیل کا خود ان کو نقصان پہنچے گا۔ ان کو صاف کہنا چاہئے کہ ہندوستان کو اُس وقت کے رائج الوقت قوانین ملک بازی کے مطابق ہم نے لیا تھا اور اب ہم عدل اور انصاف سے اِس پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ انگریز سیاستدانوں کی اِس غلط دلیل سے اٹلی اور جرمنی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بھی دوسرے مُلکوں کو تہذیب اور شائستگی سکھائیں گے چنانچہ اٹلی والوں نے یہی دلیل ابی سینیا کی جنگ کی تائید میں دی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک مدرّس دوسرے کو کس طرح منع کر سکتا ہے کہ وہ علم نہ پڑھائے۔ اس دلیل کے نئے استعمال کا نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ اب بعض قومیں صاف کہہ رہیں کہ رفاہِ عام نہیں ہم اپنے فائدہ کیلئے سب کچھ کر رہے ہیں اور ہم اپنا فائدہ چھوڑنے کیلئے کسی صورت میں تیار نہیں ہیں۔ اب تو بعض انگریز مدبرین نے بھی صاف کہہ دیا ہے کہ ہم نے ہندوستان پر اپنے فائدہ کیلئے قبضہ کر رکھا ہے مگر اٹلی والوں نے ان باتوں سے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی

ہے۔ وہ برابر یہی کہے جا رہے ہیں کہ ہم بھی رفاہِ عام کے کاموں میں حصہ لیں گے اور ثواب میں شریک ہوں گے۔

پس غلطیاں دونوں طرف ہیں اور حالت وہی ہو رہی ہے کہ ''جوگی جوگی لڑیں اور کھپروں کا نقصان''۔ جوگی آپس میں لڑنے لگے تو چھپروں کی چھتوں کو توڑ کر لکڑیاں اور سلیں ایک دوسرے کو مارنے کیلئے اُتار لیں۔ ان لڑائیوں کے نتیجہ میں وہ قومیں جن کے پاس لڑائی یا حفاظت کیلئے سامان نہیں ہیں، تباہ ہو رہی ہیں۔ پس یہ صحیح نہیں کہ ہم ان باتوں سے بے دخل ہو سکتے ہیں۔ انگلستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ جس چیز سے اُسے نقصان پہنچے اس سے ہندوستان کو بھی پہنچے گا خواہ ہندوستانی انگریزوں سے بے تعلقی ہی ظاہر کریں۔ مثلاً اگر اٹلی والے ابی سینیا میں فوجی مرکز قائم کر کے ہندوستان پر حملہ کریں تو اِس سے ہندوستانی ہی مریں گے۔

پس ہمارے لئے خاص کر ان قوموں کیلئے جو انگریزوں سے تعلقات رکھتی ہیں بہت خطرات ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ انگریز اِس جنگ سے باہر نہیں رہ سکتے۔ چین اور افغانستان وغیرہ ممالک ممکن ہے بچ جائیں مگر انگلستان کا اِن اثرات سے محفوظ رہنا محال ہے اِس لئے دوستوں کو خصوصیت سے دعائیں کرنی چاہئیں کہ آئندہ جو سامان لڑائی یا فتنہ کے ہوں اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اور ہمارے ساتھ تعلق رکھنے والی اقوام کیلئے ان سے بچنے کے سامان بھی کر دے۔ بیشک تم مسولینی [5] کی طرح گھونسہ نہیں دکھا سکتے، ہٹلر [6] کی طرح تلوار نہیں چمکا سکتے مگر دعائیں تو کر سکتے ہو اور پھر اپنے آپ کو منظّم کر سکتے ہو کیونکہ منظّم قوم کو ہر ایک اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انگریزوں کے بعض افراد سے ہمیں شکوہ ہے اور جب تک ازالہ نہ ہو جائے وہ دور نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ انگریز قوم کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے ہیں کہ اس کی تباہی کے بعد ہم نقصان سے نہیں بچ سکتے اس لئے یہ بھی دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ انگریزوں کو ایسے رستہ پر چلائے جو انہیں تباہی کی طرف لے جانے والا نہ ہو۔

پھر فرانس اور ترکی کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ شام کے بعض علاقے فرانس نے لے لئے تھے۔ پہلے اس نے وعدہ کیا تھا کہ بعد میں ان کو چھوڑ دے گا مگر اب وہ انہیں چھوڑنے کیلئے تیار نہیں۔ تُرک ان علاقوں کو مانگ رہے ہیں اور بظاہر جنگ پر آمادہ لیکن حالات بظاہر ترکوں کے سخت خلاف ہیں۔ کیونکہ چند

ماہ پہلے ترکوں کے سچے دوست صرف روسی تھے۔ جرمن بھی پہلے ان کے ساتھ تھے مگر اب چونکہ جرمنی کا اٹلی سے دوستانہ ہے اور اٹلی ترکی کے ایک علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور ترکی سے اسے مخالفت ہوگئی ہے اس وجہ سے جرمنی بھی ترکی سے دور چلا گیا ہے۔ روس کا فرانس سے معاہدہ ہو چکا ہے اس لئے روس بھی اب ترکی کی مدد نہیں کر سکتا۔ پس اِس وقت ترکی کی حکومت بالکل بے یار و مددگار ہے ہم یہاں دور بیٹھے ہوئے حالات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتے مگر جہاں تک علم ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ترکی حکومت یہ کام سال بھر بعد شروع کرتی یا سال بھر پہلے کرتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اگر وہ حبشہ کی جنگ کے موقع پر کرتی یا پھر ۱۹۳۸ء میں کرتی تو زیادہ فائدہ میں رہتی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ۔ بہرحال ترکی حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر فرانس وہ علاقے واپس نہیں کرے گا یا لیگ کی معرفت کوئی مناسب سمجھوتا نہیں ہوگا تو ہم بزورِ شمشیر یہ علاقے لے لیں گے۔ تُرک ایک ایسی قوم ہے جس نے اسلام کے کئی پہلوؤں کو ترک کر دیا ہے مگر باوجود اس کے لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی صدائیں اب بھی ان کی مسجدوں سے آتی ہیں، اب بھی ان کی نمازوں میں خدا تعالیٰ کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ اب بھی وہ سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، اِنْشَاءَ اللّٰہُ اور لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہتے ہیں۔ اگر بعض باتوں میں وہ غلطی پر ہیں تو اسلام کی بعض باتوں پر وہ قائم بھی ہیں اِس لئے ان کے دُکھوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تمام اختلافات کے باوجود یہ ہو نہیں سکتا کہ تُرک دُکھ میں ہوں اور ایک مسلمان کہلانے والا تکلیف محسوس نہ کرے۔ اِس لئے ہمیں یہ بھی دعا کرنی چاہیئے کہ اگر تُرک بہرحال لڑائی پر ہی آمادہ ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے اور انہیں طاقت دے۔ ان کی مثال یورپین حکومتوں میں ایسی ہی ہے جیسے بتّیس دانتوں میں زبان کی۔ اور ایک بـالـشـتـیـئـے کی جو پہلوان سے لڑائی پر آمادہ ہو۔ اس لئے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اوّل تو انہیں لڑائی سے بچائے اور اگر وہ لڑائی پر ہی آمادہ ہوں تو ان کی مدد کرے۔ ایک فرانسیسی محمد رسول اللہ ﷺ کا منکر ہے اور ترک قائل ہے۔ بیشک تُرک کی حکومت سے محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری حکومت قائم نہ ہو لیکن ادھوری حکومت بھی بالکل نہ ہونے سے بہتر ہے۔ پس ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ اگر لڑائی سے انہیں نقصان پہنچنا ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے ان کو بچائے اور اگر اسی طرح ان کے حقوق حاصل ہو سکتے ہوں تو انہیں ہمت دے اور نہیں تو ہم ان کی دعا سے تو مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ضرورت کے موقع پر چندے وغیرہ بھی دے سکتے ہیں مگر میں نے دیکھا ہے ہماری جماعت کے بعض کنویں کے مینڈک زلزلہ کے مصیبت زدگان کیلئے چندہ پر بھی

اعتراض کرتے تھے۔ گویا وہ اِس دنیا میں نہیں بلکہ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں ایسے لوگ شاید اس خیال پر بھی نکتہ چین ہوں مگر مجھے ان کی پرواہ نہیں۔

پس یہ بالکل غلط ہے کہ دنیا سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہمارا ہی تو واسطہ دنیا سے ہے۔ جب خدا تعالیٰ نے دنیا ہمیں دے دی ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ میں دنیا دوسروں سے چھین کر تمہارے حوالے کر دوں گا تو پھر اگر چہ اِس وقت وہ ہمارے قبضہ میں نہیں ہم اس سے کس طرح غافل رہ سکتے ہیں۔ ہمیں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کے ایک واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔ کہتے ہیں ایک شخص کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں کے ہاں لڑکے تولّد ہوئے اور وہ زچگی کے معاً بعد دور دراز مقام پر اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلی گئیں۔ کئی مہینوں کے بعد جب واپس آ رہی تھیں تو ایک کے بچہ کو بھیڑیئے نے کھالیا۔ دوسری نے خیال کیا کہ اس کا خاوند اب اسے محبت نہیں کرے گا کیونکہ اس کے بچہ نہیں اس لئے اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ دوسری کے پاس جو لڑکا ہے وہ دراصل میرا ہے۔ یہ جھگڑا حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچا۔ آپ نے بچہ کو ہاتھ میں لے لیا اور کہا کہ اس امر کا فیصلہ مشکل ہے کہ دراصل یہ کس کا بچہ ہے میں اسے آدھا آدھا کر کے بانٹ دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ چھری لاؤ اور چھری منگوا کر بچہ کے پیٹ پر رکھ دی گویا کاٹنے لگے ہیں۔ یہ دیکھ کر جس کا بچہ مر چکا تھا اُس نے کہا کہ یہ بالکل انصاف ہے پس آپ آدھا آدھا بانٹ دیں۔ اس نے خیال کیا کہ اس طرح اس کا بچہ بھی مر جائے گا اور ہم دونوں برابر ہو جائیں گی۔ مگر ماں کی مامتا جوش میں آئی اور اُس نے کہا حضور! بچہ دراصل اسی کا ہے میرا نہیں آپ اسے ہی دے دیں۔ کیونکہ اُس نے خیال کیا کہ بچہ خواہ اس کے پاس ہی رہے مگر بچ جائے۔ اِس سے سبق ملتا ہے کہ جس کی چیز ہو وہ اُس کی تباہی کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پس جبکہ ہمارا خدا ہمیں کہتا ہے کہ زمین وآسمان تمہارے لئے ہیں۔ پھر وہ لوگ کتنے پاگل ہیں جو کہتے ہیں کہ مصیبت زدگانِ زلزلہ کے لئے چندہ مت کرواور ان باتوں پر کہنے لگ جاتے ہیں کہ خلیفہ سیاسی کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ اگر تمہیں ان کاموں میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں تو تم دنیا کی ملکیت سے دستبردار ہو چکے ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ آپ ایک دفعہ بیت الدعا میں دعا کر رہے تھے اوپر مولوی صاحب نے اپنے لئے دعا کا کمرہ بنوایا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کہتے ہیں مجھے ایسی آواز نیچے سے آئی جس طرح کوئی عورت دردِ زہ میں مبتلا ہو

اور آہ وزاری کر رہی ہو۔ میں نے کان لگا کر سنا تو معلوم ہوُا حضرت مسیح موعود علیہ السلام دعا کر رہے ہیں اور یہ فقرہ بار بار آپ کی زبان پر آتا ہے کہ الٰہی! اگر مخلوق اسی طرح طاعون سے تباہ ہوتی گئی تو تیرے پیغاموں پر ایمان کون لائے گا؟ یہ ہے ہمارا امام مگر تم ہو کہ ہر نیکی کے کام پر بعض منافق شرارت سے اور بعض کمزور بیوقوفی سے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ کام نہ کریں، ہمارا کیا واسطہ ہے۔ حالانکہ دنیا سے واسطہ ہمارا ہی ہے۔ لوگ اگر ڈوبیں تو بچانا ہمارا فرض ہے، اگر قحط سے مریں تو کھلانا ہمارا فرض ہے، اگر لڑنے لگیں تو صلح کرانا ہمارا فرض ہے اور اگر لڑ پڑیں تو حقدار کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے اور اگر ابھی مادی طور پر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو کم سے کم ہمیں دعا تو ضرور کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ ہاں یہ یاد رکھو کہ جب تک امام نہ کہے کہ کیا دعا کرنی ہے اُس وقت تک یہی دعا کرتے رہو کہ الٰہی! جس میں تیرے دین اور اسلام کی خیر ہو وہی کر دے۔

پس زمانہ سخت نازک ہے۔ پھر بھائی بھائی کا گلا کاٹنے کو تیار ہے۔ دنیا پھر ایک بار قیامت کا نظارہ دیکھنے کیلئے بیتاب ہے اور اگر ہمارے ہاتھوں میں نہیں تو ہمارے دل میں طاقت ضرور ہے اس لئے ہمیں اپنے قوی دل لے کر خدا تعالیٰ کے پاس جانا چاہئے اور دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کو سمجھ دے اور وہ لڑائی سے بچ جائیں اور اگر لڑائی ہو تو غلبہ اُسے عطا کرے جس کا جیتنا اسلام کیلئے مفید ہو۔ اور اللہ تعالیٰ برطانوی حکومت کو بھی صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے اور اِسے ایسے نقصان سے بچائے جو سلسلہ اور اسلام کیلئے نقصان کا موجب ہو۔

پھر ہمیں تُرکوں کیلئے بھی دعا کرنی چاہئے آخر وہ اسلام کے نام لیوا ہیں۔ اگر لڑنا ان کیلئے مضر ہو تو اللہ تعالیٰ انہیں لڑائی سے بچالے۔ اور اگر مفید ہو تو ان کے ہاتھوں میں طاقت وقوت عطا کرے اور ان کے دشمنوں کے ہاتھوں کو شَل کر دے تا یہ بہادر قوم جو سینکڑوں سال سے مسیحی دنیا کے تعصّب کا شکار ہو رہی ہے، اسلام کے نام کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا نہ ہو۔

(الفضل ۲۳ رجنوری ۱۹۳۷ء)

۱؎ **ہلاکو خان:** اِس کا دورِ حکومت ۱۲۵۱ء تا ۱۲۶۴ء ہے۔ یہ ایران کے ایل خانی خاندان کا بانی اور چنگیز خان کا پوتا تھا۔ باپ کا نام تولی خان تھا۔ اس نے ایران کے مختلف حصوں کو یکجا کر کے ایران میں ایل خانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے بھائی منگوقاآن کی ہدایت پر ۱۲۵۱ء میں

اسمٰعیلیوں کے مشہور قلعہ الموت کو فتح کیا۔ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کیا اور لاکھوں افراد قتل کئے۔ موصل کے حکمران کو سفاکی سے قتل کیا۔

(اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد۲ ،صفحہ ۱۸۵۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء)

۲۔ **نادرشاہ** (۱۶۸۸ء۔۱۷۴۷ء): ۱۷۳۶ء تا ۱۷۴۷ء شاہِ ایران رہا۔ یہ خاندان افشار کا بانی تھا۔صفوی خاندان کی حکومت میں افغانوں اور ترکوں پر فتح حاصل کرکے طاقتور ہوگیا۔صفوی خاندان کو ختم کرکے خود بادشاہ بن گیا۔ ۱۷۳۹ء کے کامیاب حملے میں ہندوستان سے بہت کچھ مال ومتاعِ بالخصوص کوہِ نور ہیرا اور تختِ طاؤس اپنے ہمراہ لے گیا۔اس کی فتوحات سے ایران کو بہت وسعت حاصل ہوگئی لیکن اس کے مرتے ہی شیرازہ بکھر گیا اور دولت لُٹ گئی یہاں تک کہ کوہِ نور بھی افغانستان پہنچ گیا۔ ہندوستان سے واپسی پر خیوا اور بخارا فتح کئے۔کُردوں کی بغاوت فرو کرنے کے دوران افشار قبیلے کے ہاتھوں اپنے خیمے میں ہی مارا گیا۔

(اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد۲ صفحہ ۱۶۹۲ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء)

۳۔ المائدہ: ۳۳

۴۔ **بابر:** ظہیرالدین محمد بن عمر شیخ مرزا ۱۴ر فروری ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ر دسمبر ۱۵۳۰ء میں وفات پائی۔ باپ کی طرف سے تیموری اور ماں کی طرف سے چغتائی چنگیزی۔ ۸ر جون ۱۴۹۴ء کو سوا گیارہ برس کی عمر میں بمقام فرغانہ تخت نشین ہوا۔ بابر کو دس برس تک فتح وشکست کے نشیب وفراز دیکھنے کے بعد وطن چھوڑنا پڑا۔ ۱۵۰۴ء میں بابر کابل پہنچ کر بادشاہ بن گیا۔ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی وآگرہ پر قابض ہوا۔ ۱۵۲۷ء میں راجپوتوں کو شکست دی۔ دوسری طرف سلطنت کی مشرقی سرحد بنگال تک پہنچا دی۔ ۴۹ برس کی عمر میں بمقام آگرہ وفات پائی اور اسے ''باغِ بابر'' کابل میں دفن کیا گیا۔

(اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل صفحہ ۱۹۷،مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء)

۵۔ **مسولینی** (Mussolini Benito)۔اطالوی آمر۔ایک لوہار کا بیٹا تھا۔(پیدائش ۱۸۸۳ء۔ وفات ۱۹۴۵ء) اس نے ابتدائی برسوں میں ایک اُستاد اور صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔سوشلسٹ تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹۰۵ء میں فوج میں بھرتی ہوا۔پہلی جنگ عظیم کے دوران اطالیہ کی جنگ میں

مداخلت کی وکالت کی پاداش میں ۱۹۱۴ء میں سوشلسٹ تحریک سے نکال دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے اپنی جماعت بنائی۔ اس نے سوشلسٹوں کے خلاف دہشت کا بازار گرم کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اس کو شاہِ اٹلی اور فوج نے وزیرِ اعظم کے عہدے پر نامزد کیا۔ ۱۹۲۵ء میں اس نے آمرانہ اختیارات سنبھال لئے۔ ۱۹۲۶ء میں تمام مخالف جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دیا۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ایتھوپیا پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۰ء میں جنگ عظیم میں شامل ہوا۔ اتحادیوں کے سسلی پر قبضہ سے اس کی ساکھ ختم ہوگئی۔

(اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۲ صفحہ ۱۵۶۵۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء)

۶ ہٹلر (Hitler Adolf) (۱۸۸۹ء۔۱۹۴۵ء) جرمنی کا آمرِ مطلق۔ نازی پارٹی کا بانی اور رہنمائے اعظم۔ ایک آسٹروی عہدہ دار محصولات کا بیٹا تھا۔ میونخ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۷ء میں وی آنا چلا گیا۔ اس نے انتہائی غریبی میں دن گزارے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ میونخ چلا گیا۔ پہلی عالمی جنگ میں فوج میں بھرتی ہوا۔ کارپورل بنا، شجاعت کا تمغہ آہنی صلیب (Iron Cross) حاصل کیا۔ جنگ کے بعد اس نے نازی مزدور پارٹی کی بنیاد رکھی۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں اسے آمریت کے اختیارات سونپے گئے جس کے نتیجہ میں جرمنی پر نازیوں کی مطلق العنانی قائم ہوگئی۔ ہٹلر جرمنوں کی زندگی کے تمام شعبوں کا مختار بن گیا۔ ۱۹۳۴ء میں مخالفین کو کچل دیا۔ اس نے جرمنی کو دوسری عالمی جنگ کی راہ پر ڈالا۔ ۱۹۴۱ء میں روس کے محاذ پر اس نے جنگ کی کمان خود سنبھالی جس کا نتیجہ تباہی خیز ہوا۔ ۳۰/اپریل ۱۹۴۵ء میں جبکہ اتحادی فوجیں چاروں طرف سے بڑھتی چلی آرہی تھیں، ہٹلر نے ایوا براؤن کے ساتھ چند گھنٹے پہلے شادی کر لی۔ برلن میں خودکشی کر لی۔

(اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۲ صفحہ ۱۸۴۶ء مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء)